

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۲)

اور ابراہیم کو بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔" یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پوج رہے ہو وہ تو محض بت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تمہیں کوئی رزق ہی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف تم پٹائے جانے والے ہو۔ اور اگر تم جھٹلاتے ہو تو تم سے پہلے بہت سی قومیں

۱۱۱۱ قابل کیے لیے ملاحظہ ہو البقرہ رکوع ۱۵-۱۶-۳۵- آل عمران ۷۷- الانعام ۹- ہود ۷۷- ابراہیم ۴
الحجر ۳- الانبیاء ۵- الشعراء ۵- الصافات ۳- الزخرف ۳- الذاریات ۲-
۱۱۱۱ یعنی اس کے ساتھ ترک اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈرو۔

۱۱۱۱ یعنی تم یہ بت نہیں گھڑ رہے ہو بلکہ ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ ان تینوں کا وجود خود ایک جھوٹ ہے۔ اور پھر تمہارے یہ عقائد کہ یہ دیویاں اور دیوتا ہیں، یا خدا کے اوتار یا اس کی اولاد ہیں، یا خدا کے مقرب اور اس کے ہاں نسیح ہیں، یا یہ کہ ان میں سے کوئی شفا دینے والا اور کوئی اولاد دینے والا اور کوئی روزگار دلانے والا ہے، یہ سب جھوٹی باتیں ہیں جو تم لوگوں نے اپنے دہم و گمان سے تصنیف کر لی ہیں۔ حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ یہ محض بت ہیں بے جان، بے اختیار اور بے اثر۔

۱۱۱۱ ان چند فقروں میں حضرت ابراہیم نے بت پرستی کے خلاف تمام معقول دلائل سمیٹ کر رکھ دیئے ہیں۔ کسی کو مجبور بنانے کے لیے لامحالہ کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔ ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی ذات میں معبودیت کا کوئی استحقاق رکھتا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ آدمی کا خالق ہو اور آدمی اپنے وجود کے لیے اس کا رہن منت ہو۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ آدمی کی پرورش

جھٹلا چکی نہیں، اور رسول پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے
کیا ان لوگوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے کہ اللہ کس طرح خلق کی ابتدا کرتا ہے

کاسمان کرتا ہوا اور اسے رزق یعنی متاعِ زلیست بہم پہنچاتا ہو۔ جو تھی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی کا
مستقبل اس کی عنایات سے وابستہ ہوا اور آدمی کو ازیشہ ہو کہ اس کی ناراضی مولیٰ لیکر وہ اپنا انجام
خراب کر دیکے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ان چاروں وجہ میں سے کوئی وجہ بھی بت پرستی کے حق میں
نہیں ہے بلکہ ہر ایک خالص خدا پرستی کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ محض بت ہیں، کہہ کر انہوں نے پہلی وجہ کو
ختم کر دیا، کیونکہ جو ثابت ہو اس کو معبود ہونے کا آخر کیا ذاتی استحقاق حاصل ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کہہ
کہ تم ان کے خالق ہو، دوسری وجہ بھی ختم کر دی، اس کے بعد تیسری وجہ کو یہ فرمایا کہ ختم کیا کہ وہ نہیں
کسی نوعیت کا کچھ بھی رزق نہیں دے سکتے۔ اور آخری بات یہ ارشاد فرمائی کہ تمہیں پلٹنا تو خدا کی طرف
ہے نہ کہ ان بتوں کی طرف، اس لیے تمہارا انجام اور تمہاری عاقبت سنو اور یا بگاڑنا بھی ان کے اختیار میں
نہیں صرف خدا کے اختیار میں ہے اس طرح شرک کا پورا ابطال کر کے حضرت ولاتے یہ بات ان پر
واضح کر دی کہ جتنے وجہ سے بھی انسان کسی کو معبود قرار دے سکتا ہے وہ سب اللہ وحدہ
لا شریک کے سوا کسی کی عبادت کے مقتضی نہیں ہیں۔

نتیجہ یعنی اگر تم میری دعوت تو حید کو اور اس خبر کو کہ تمہیں اپنے رب کی طرف پلٹنا اور اپنے
اعمال کا حساب دینا ہے، جھٹلانے ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں اس سے پہلے بھی
بہت سے نبی (مثلاً نوح، ہود، صالح، عیسیٰ، عیسیٰ وغیرہ) یہی تعلیم لیکر آچکے ہیں اور ان کی قوموں نے
بھی ان کو اسی طرح جھٹلایا ہے۔ اب تم خود دیکھو کہ انہوں نے جھٹلا کر ان نبیوں کا کچھ بگاڑا یا اپنا
انجام خراب کیا۔

اللہ یہاں سے لَھُمَّ عَذَابٌ أَلِيمٌ (ان کے لیے دردناک سزا ہے) تک ایک جملہ متعزفہ
ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے قصے کا سلسلہ تو ذکر اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے
اس اقرار ہی تقریر کی مناسبت یہ ہے کہ کفار مکہ، جنہیں سبق دینے کے لیے یہ قصہ سنایا جا رہا ہے

پھر اس کا اعادہ کرتا ہے؛ یقیناً یہ دعاوہ تو اللہ کے لیے آسان تر ہے۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے، پھر اللہ بار دیگر بھی زندگی بخشے گا۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جسے چاہے مزائے اور جس پر چاہے رحم فرمائے، اسی کی طرف تم پھیرے جانے والے ہو تم نہ زمین میں عاجز کرنے والے ہو نہ آسمان میں، اور اللہ سے بچانے والا کوئی مسرپرست اور مددگار تمہارے لیے

دو بنیادی گراہیوں میں مبتلا تھے۔ ایک شرک و بت پرستی جو سرے انکارِ آخرت۔ ان میں سے پہلی گراہی کا رد حضرت ابراہیم کی اس تقریر میں آچکا ہے جو اوپر نقل کی گئی ہے۔ اب دوسری گراہی کے رد میں یہ چند فقرے اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ارشاد فرما رہے تاکہ دونوں کی تردید ایک ہی سلسلہ کلام میں ہو جائے۔
 ۱۲۲ یعنی ایک طرف بے شمار اشیاء عدم سے وجود میں آتی ہیں، اور دوسری طرف ہر نوع کے افراد ٹٹنے کے ساتھ پھر ویسے ہی افراد وجود میں آنے چلے جاتے ہیں مشرکین اس بات کو مانتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ کی صفتِ خلق و ایجاد کا نتیجہ ہے۔ انہیں اللہ کے خالق ہونے سے انکار نہ تھا جس طرح آج کے مشرکین کو نہیں ہے۔ اس یسوان کی اپنی مانی ہوئی بات پر یہ دلیل قائم کی گئی ہے کہ جو خدا تمہارے نزدیک اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا ہے، اور پھر ایک ہی دفعہ تخلیق کر کے نہیں رہ جاتا بلکہ تمہاری آنکھوں کے سامنے مٹ جانے والی اشیاء کی جگہ پھر وہی ہی اشیاء پیسے در پیسے وجود میں لاتا چلا جاتا ہے اس کے بارے میں آخر تم نے یہ کیوں سمجھ رکھا ہے کہ تمہارے مرنے کے بعد وہ پھر تمہیں دوبارہ زندہ کر کے اٹھا کھڑا نہیں کر سکتا۔

۱۲۳ یعنی جب خدا کی کارگیری سے بار اول کی تخلیق کاتم خود مشاہدہ کر رہے ہو تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ اسی خدا کی کارگیری سے بار دیگر بھی تخلیق ہوگی۔ ایسا کہنا اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۱۲۴ یعنی تم کسی ایسی جگہ بھاگ کر نہیں جا سکتے جہاں اللہ کی گرفت سے بچ نکلو۔ خواہ تم زمین کی تہوں میں کہیں از جا تہ یا آسمان کی بلندیوں میں پہنچ جاؤ، بہر حال تمہیں ہر جگہ سے پکڑ لایا جائیگا اور اپنے رب کے

نہیں پہلے یہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا اور اس سے ملاقات کا انکار کیا ہے وہ میری رحمت سے مایوس ہو چکے ہیں اور ان کے لیے درون ملک منزا ہے۔

پھر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا قتل کر دو اسے

ساتھ تم حاضر کر دیے جاؤ گے۔ یہی بات سمدہ رحمن میں جنوں اور انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے چیلنج کے انداز میں فرمائی گئی ہے کہ تم خدا کی خدائی سے اگر نکل سکتے ہو تو ذرا نکل کر دکھاؤ، اس سے نکلنے کے لیے زور چاہئے

اور وہ زور تمہیں حاصل نہیں ہے، اس لیے تم ہرگز نہیں نکل سکتے۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ (رکوع ۲۲)۔

۳۵ یعنی نہ تمہارا اپنا زور اتنا ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ، اور نہ تمہارا کوئی ولی و سرپرست یا مددگار ایسا نور آور ہے کہ خدا کے مقابلے میں تمہیں پناہ دے سکے اور اس کے مواخذہ سے تمہیں بچائے۔

ساری کائنات میں کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے، جنہوں نے احکام خداوندی کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے جنہوں نے جرات و جسارت کے ساتھ خدا کی نافرمانیاں کی ہیں

اور اس کی زمین میں ظلم و فساد کے طوفان اٹھاتے ہیں، ان کا حمایتی بن کر اٹھ سکے اور خدا کے فیصلہ عذاب کو ان پر نافذ ہونے سے روک سکے، یا خدا کی عدالت میں یہ کہنے کی ہمت کر سکے کہ یہ میرے ہیں اس لیے

جو کچھ بھی انہوں نے کیا ہے اسے معاف کر دیا جاتے۔

۳۶ یعنی ان کا کوئی حصہ میری رحمت میں نہیں ہے۔ ان کے لیے کوئی گنجائش اس امر کی نہیں ہے

کہ وہ میری رحمت میں سے حصہ پانے کی امید رکھ سکیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب انہوں نے اللہ کی آیات کو ماننے سے انکار کیا تو خود بخود ان وعدوں سے فائدہ اٹھانے کے حق سے بھی وہ دست بردار ہو گئے

جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والوں سے کیے ہیں۔ پھر جب انہوں نے آخرت کا انکار کیا اور یہ تسلیم ہی نہ کیا کہ انہیں کبھی اپنے خدا کے حضور پیش ہونا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے خدا کی بخشش و مغفرت

کے ساتھ کوئی رشتہ امید مرے سے وابستہ ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد جب اپنی توقعات کے خلاف وہ عالم آخرت میں آنکھیں کھولیں گے اور اللہ کی ان آیات کو بھی اپنی آنکھوں سے سچا اور برحق دیکھ لیں گے

یا جلاؤا لو اس کو^۹ آخر کار اللہ نے اسے آگ سے بچا لیا، یقیناً اس میں نشانیاں ہیں ان

جنہیں وہ جھٹلا چکے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہاں وہ رحمت الہی میں سے کوئی حصہ پانے کے امیدوار ہو سکیں۔
۳۲۷ یہاں سے پھر سلسلہ کلام حضرت ابراہیم کے قصے کی طرف مڑتا ہے۔

۳۲۸ یعنی حضرت ابراہیم کے معقول دلائل کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ ان کا جواب اگر تھا تو یہ کہ کاٹ دو اس زبان کو جو حق بات کہتی ہے اور جینے نہ دو اس شخص کو جو ہماری غلطی ہم پر واضح کرتا ہے اور ہمیں اس سے باز آنے کے لیے کہتا ہے۔ قتل کرو یا جلاؤا لو کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پورا مجمع اس بات پر تو متفق تھا کہ حضرت ابراہیم کو ہلاک کر دیا جائے، البتہ ہلاک کرنے کے طریقہ میں اختلاف تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ قتل کیا جاتے، اور کچھ کی رائے یہ تھی کہ زندہ جلا دیا جائے تاکہ ہر اس شخص کو عبرت حاصل ہو جسے آئندہ کبھی ہماری سرزمین میں حق گوئی کا جنون لاحق ہو۔

۳۲۹ اس فقرے سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار ابراہیم علیہ السلام کو جلانے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ آگ میں پھینک دیئے گئے تھے یہاں بات صرف اتنی کہی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے بچا لیا۔ لیکن سورۃ الانبیاء میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ آگ اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم کے لیے ٹھنڈی اور غیر مضر ہو گئی، قُلْنَا إِنَّا لَنُؤْتِي بِرَدِّهِ سَلَامًا عَلٰی اِبْرٰهٖمَ (در کوہ ۵)۔ ہم نے کہا کہ آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کو آگ میں پھینکا ہی نہ گیا ہوتا تو آگ کو یہ حکم دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ تو ان پر ٹھنڈی ہو جا اور ان کے لیے سلامتی بن جا۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ثابت ہوتی ہے کہ تمام اشیاء کی خاصیتیں اللہ تعالیٰ کے حکم پر مبنی ہیں، اور وہ جس وقت جس چیز کی خاصیت کو چاہے بدل سکتا ہے۔ معمول کے مطابق آگ کا عمل یہی ہے کہ وہ جلاتے اور ہر آتش پذیر چیز اس میں ڈپ کر کے جل جاتے لیکن آگ کا یہ معمول اس کا اپنا قائم کیا ہوا نہیں ہے بلکہ خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اور اس معمول نے خدا کو پابند نہیں کر دیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کوئی حکم نہ دے سکے۔ وہ اپنی آگ کا مالک ہے کسی وقت بھی وہ اسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ جلانے کا عمل چھوڑ دے۔ کسی وقت بھی وہ اپنے ایک اشارے سے آتشکدے کو گلزار میں تبدیل کر سکتا ہے۔

لوگوں کے لیے جو ایمان لانے والے نہیں۔ اور اس نے کہا: تم نے دنیا کی زندگی میں تو اللہ کو چھوڑ کر تمہوں کو اپنے درمیان محبت کا ذریعہ بنا لیا ہے مگر قیامت کے روز تم ایک دوسرے کا انکار اور ایک دوسرے پر لعنت کرو گے اور آگ تمہارا ٹھکانا ہوگی اور

یہ غیر معمولی خرق عادت اس کے ہاں روز روز نہیں ہوتے کسی بڑی حکمت اور مصلحت کی خاطر ہی ہوتے ہیں لیکن معمولات کو جنہیں روزمرہ دیکھنے کے ہم خود کہیں، اس بات کے لیے ہرگز دلیل نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان سے بندھ گئی ہے اور خلاف معمول کوئی واقعہ اللہ کے حکم سے بھی نہیں سکتا۔ بلکہ یعنی نشانیاں ہیں اس بات میں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خاندان، قوم اور ملک کے مذہب

کی پیروی کرنے کے بجائے اس علم حق کی پیروی کی جس کی رو سے انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ شرک باطل ہے اور توحید ہی حقیقت ہے۔ اور اس بات میں کہ وہ قوم کی بٹ دھری اور اس کے شدید قصب کی پروا کیے بغیر

اس کو باطل سے باز اہلنے اور حق قبول کر لینے کے لیے پیہم تبلیغ کرتے رہے۔ اور اس بات میں کہ وہ آگ کی ہولناک سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے مگر حق و صداقت سے منہ مٹانے کے لیے تیار نہ ہوئے

اور اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل علیہ السلام تک کو آزمائشوں سے گوارے بغیر چھوڑا۔ اور اس بات میں کہ جب حضرت ابراہیم اللہ کے ڈالے ہوئے امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر

گئے تب اللہ کی مدد ان کے لیے آئی اور ایسے معجزانہ طریقے سے آئی کہ آگ کا الاوان کے لیے ٹھنڈا کر دیا گیا

۱۱۱۱ سلسلہ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بات آگ سے سلامت نکل آنے کے بعد حضرت

ابراہیم نے لوگوں سے فرمائی ہوگی۔

۱۱۱۲ یعنی تم نے خدا پرستی کے بجائے بت پرستی کی بنیاد پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر کر لی ہے جو ذہنی زندگی کی حد تک تمہارا قومی شیرازہ باندھ سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی عقیدے پر بھی لوگ جمع ہو

سکتے ہیں، خواہ حق ہو یا باطل۔ اور ہر اتفاق و اجتماع، چاہے وہ کیسے ہی غلط عقیدے پر ہو، باہم دوستی، رشتہ داریوں، برادریوں اور دوسرے تمام مذہبی، معاشرتی و تمدنی اور معاشی و سیاسی تعلقات کے قیام کا

ذریعہ بن سکتا ہے۔

کوئی تمہارا مددگار نہ ہوگا۔ اس وقت ٹوٹنے اس کو مانا۔ اور ابراہیم نے کہا میں اپنے رب
 کا عقیدہ باطلہ پر تمہاری یہ بیعت اجتماعی آخرت میں نبی نہیں رہ سکتی۔ وہاں آپس کی محبت
 دوستی، تعاون، رشتہ داری، اور عقیدت و ارادت کے صرف وہی تعلقات برقرار رہ سکتے ہیں جو دنیا میں
 خدائے واحد کی بندگی پر قائم ہوتے ہوں۔ کفر و شرک پر جڑے ہوتے سارے رشتے وہاں کٹ جائیں گے
 ساری محبتیں دشمنی میں تبدیل ہو جائیں گی، ساری عقیدتیں نفرت میں بدل جائیں گی۔ وہاں بیٹے اور باپ،
 شوہر اور بیوی، پیر اور مرید تک ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور ہر ایک اپنی گمراہی کی ذمہ داری
 دوسرے پر ڈال کر پکارے گا کہ اس ظالم نے مجھے خراب کیا اس لیے اسے دم سے عذاب دیا جائے یہ بات
 قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورہ زخرف میں فرمایا اَلَاخِلَافُ يَوْمَئِذٍ لَّيْسَ
 لِبَعْضِنَا عَدُوٌّ لِّآلِ الْمُتَّقِينَ (رکوع ۶) دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، سوائے
 متقین کے۔ سورہ اعراف میں فرمایا کَلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَعْنَتٌ اُخْتَهَا حَتَّىٰ اِذَا دَاكُرُوْا فِيهَا
 جَمِيْعًا قَالَتْ اٰخِرُنَا لَوْلَا وَاوَّلَانَا فَاتَّبَعُوْنَا اَبَا ضِعْفَانَ النَّارِ
 (رکوع ۴) ”یہ گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا حتیٰ کہ
 جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے حق میں کہے گا کہ اے ہمارے رب،
 یہ لوگ تجھے جہنم نے ہمیں گمراہ کیا، لہذا انہیں آگ کا دُہرا عذاب دے۔“ اور سورہ احزاب میں فرمایا
 وَقَالُوْا رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَنَا وَكِبْرَانَنَا فَاَصَلُّوْنَا اَسْبِيْلًا رَبَّنَا اِنْتُمْ صٰغِقِيْنَ مِنَ الْعَدٰٓاِبِ
 وَالْعَنَتُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (رکوع ۸) ”اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب، ہم نے اپنے سرداروں
 اور بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو راہ سے بے راہ کر دیا، اے ہمارے رب تو انہیں دہری
 سزا دے اور ان پر سخت لعنت فرما۔“

۳۳۳ ترتیب کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم آگ سے نکل آئے اور انہوں نے
 اوپر کے فقرے ارشاد فرمائے اس وقت سارے مجمع میں صرف ایک حضرت ٹوٹے جہنم کے آگے
 بڑھ کر ان کو ماننے اور ان کی پیروی اختیار کرنے کا اعلان کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر دوسرے بہت

کی طرف ہجرت کرنا ہوں، وہ زبردست ہے اور حکیم ہے۔ اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب جیسی اولاد عنایت فرمائی اور اس کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھ دی، اور

سے لوگ بھی اپنے دل میں حضرت ابراہیمؑ کی صداقت کے قائل ہو گئے ہوں۔ لیکن پوری قوم اور سلطنت کی طرف سے دین ابراہیمؑ کے خلاف جس خنیناک جذبے کا اظہار اُس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اُسے دیکھتے ہوئے کوئی دوسرا شخص ایسے خطرناک حق کو ماننے اور اس کا ساتھ دینے کی جرأت نہ کر سکا یہ سعادت صرف ایک آدمی کے حصے میں آئی اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ تھے جنہوں نے ہجرت میں بھی اپنے چچا اور چچی (حضرت سارہ) کا ساتھ دیا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے۔ ایک شخص سوال کر سکتا ہے کہ کیا اس واقعہ سے پہلے حضرت لوطؑ کافر و مشرک تھے اور آگ سے حضرت ابراہیمؑ کے سلامت نکل آنے کا معجزہ دیکھنے کے بعد انہیں نعمت ایمان ملیس آئی؟ اگر یہ بات ہے تو کیا نبوت کے منصب پر کوئی ایسا شخص بھی سرفراز ہو سکتا ہے جو پہلے مشرک رہ چکا ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں خاصتاً لَٰذَ لُوٰطُ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے حضرت لوطؑ خداوند عالم کو نہ مانتے ہوں، یا اس کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہوں۔ بلکہ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی رسالت کی تصدیق کی اور ان کی پیروی اختیار کر لی۔ ایمان کے ساتھ جیب لام کا صلہ آتا ہے تو اس کے معنی کسی شخص کی بات ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت لوطؑ اس وقت ایک نو عمر لڑکے ہی ہوں اور اپنے ہوش میں ان کو پہلی مرتبہ اس موقع پر ہی اپنے چچا کی تعلیم سے واقف ہونے اور ان کی شان رسالت سے آگاہ ہونے کا موقع ملا ہو۔

۲۵ یعنی اپنے رب کی خاطر ملک چھوڑ کر نکلتا ہوں، اب جہاں میرا رعب جائیگا وہاں چلا جاؤنگا۔

۲۶ یعنی وہ میری حمایت و حفاظت پر قادر ہے اور میرے حق میں اس کا جو فیصلہ بھی ہوگا حکمت

پر مبنی ہوگا۔

اسے دنیا میں اس کا اجر عطا کیا اور آخرت میں وہ یقیناً صالحین میں سے ہوگا۔
 اور ہم نے لوط کو بھیجا جبکہ اس نے اپنی قوم سے کہا: تم لوگ تو وہ فحش کام کرتے
 ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ کیا تمہارا یہ حال ہے کہ

۴۷ حضرت اسحاق بیٹے تھے اور حضرت یعقوب پوتے۔ یہاں حضرت ابراہیم کے دوسرے بیٹوں
 کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا ہے کہ اولاد ابراہیم کی بدیانی شاخ میں صرف حضرت شعیب مبعوث ہوئے
 اور اسماعیل شاخ میں سرکار رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ڈھائی ہزار سال کی مدت میں کوئی نبی
 نہیں آیا۔ اس کے برعکس نبوت اور کتاب کی نعمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک مسلسل اس شاخ کو
 عطا ہوتی رہی جو حضرت اسحق علیہ السلام سے چلی تھی۔

۴۸ اس میں وہ تمام انبیاء آگئے جو نسل ابراہیمی کی سب شاخوں میں مبعوث ہوئے ہیں۔
 ۴۹ مقصود بیان یہ ہے کہ بائبل کے وہ حکمران اور پڑت اور پروہت جنہوں نے ابراہیم علیہ
 السلام کی دعوت کو نیچا دکھانا چاہا تھا، اور اس کے وہ شرک باشندے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے
 ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کہیں ان کا نام
 نشان تک باقی نہیں۔ مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بند کرنے کے جرم میں ان لوگوں نے جلا کر خاک کر دینا
 چاہا تھا، اور جسے آخر کار بے سرو سامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے
 یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔
 دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اس خلیل رب العالمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔
 دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی ہدایت کی روشنی میسر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی
 پاکیزہ اولاد کی بدولت میسر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجر عظیم اس کو ملے گا وہ تو ملے گا ہی، مگر اس
 دنیا میں بھی اس نے وہ عزت پائی جو حصول دنیا کے پیچھے جان بھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی
 ۵۰ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاغراف، رکوع ۱۰، ہود، ۲، الحجر، ۵، الایمان، ۵، الشعراء، النمل، ۱۱، الصافات۔

مردوں کے پاس جاتے ہو، اور نہرتی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو؟“
پھر کوئی جواب اس کی قوم کے پاس اس کے سوا نہ تھا کہ ”اے اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے“
لوٹنے کہا ”اے میرے رب ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔“

اور جب ہمارے فرستادے ابراہیمؑ کے پاس بشارت لیکر پہنچے تو انہوں نے اس سے
کہا ”ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں۔“ فی الواقع اس کے لوگ سخت
ظالم ہو چکے تھے۔ ابراہیمؑ نے کہا ”وہاں تو لوط موجود ہے۔“ انہوں نے کہا ”ہم خوب

۱۵ یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے اِنَّكُمْ تَأْتُونَ الرِّجَالَ
شَهْوَةً مِّنْ دُونِ النِّسَاءِ تم خواہش نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھو کر مردوں کے پاس جاتے ہو۔“
۱۶ یعنی یہ فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے
اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سورہ نمل میں فرمائی ہے اَنَا تَوْنًا لِّفَاجِحَتِهِمْ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُونَ
”کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو۔“

۱۷ سورہ ہود اور سورہ حجر میں اس کی تفصیل یہ بیان ہوئی ہے کہ جو فرشتے قوم لوط پر نازل
نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیمؑ کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے انجناب
کو حضرت اسماعیلؑ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوبؑ کی پیدائش کی بشارت دی، پھر بتایا کہ ہمیں قوم
لوط کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

۱۸ ”اس بستی“ کا اشارہ قوم لوط کے علاقے کی طرف ہے حضرت ابراہیمؑ اُس وقت فلسطین
کے شہر جبرون (موجودہ الخلیل) میں رہتے تھے۔ اس شہر کے ٹھیک مشرق میں چند میل کے فاصلے
پر بحیرہ مردار (DEAD SEA) کا وہ حصہ واقع ہے جہاں پہلے قوم لوط آباد تھی اور اب
جس پر بحیرہ کا پانی پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ نشیب میں واقع ہے اور جبرون کی بلند پہاڑیوں پر سے
صاف نظر آتا ہے۔ اسی لیے فرشتوں نے اس کی طرف اشارہ کر کے حضرت ابراہیمؑ سے عرض کیا کہ
”ہم اس بستی کو ہلاک کرنے والے ہیں۔“

جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہے۔ ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس کے باقی سب گھر والوں کو چالیں گے اس کی بیوی پیچھے رہ جائے والوں میں سے تھی۔

۵۵ سورہ ہود میں اس قصے کا ابتدائی حصہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت ابراہیمؑ فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر مبی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ بنا کرتا ہے۔ پھر جب انہوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ مہم قوم لوط کی طرف جا رہی ہے تو آپ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ رحم کی درخواست کرنے لگے (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْحُ وَجَاءَتْهُ الْبَشْرٰى يُجَادِلُنَا فِى قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَخَلِيْمٌ اَوْ اَكْمِيْنٌ)۔ مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملہ میں اب کچھ نہ کہو، تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عذاب اب ٹپنے والا نہیں ہے (يٰۤاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَاءَ اَمْرٌ بِكَ وَ اِنَّهٗمْ اَتٰبُهُمْ عَذَابٌ غَيْرٌ مَّذُوْرٍ) اس جواب سے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ امید باقی نہ رہی کہ قوم لوط کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا، تب انہیں حضرت لوط کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ "وہاں تو لوط موجود ہے" یعنی یہ عذاب اگر لوط کی موجودگی میں نازل ہوتا تو وہ اور ان کے اہل عیال اس سے کیسے محفوظ رہیں گے۔

۵۶ اس عورت کے متعلق سورہ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوط کی خادما نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود، عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلیب یہ ہے کہ حضرت لوط ہجرت کے بعد جب اردن کے علاقے میں آکر آباد ہوتے ہو گئے تو انہوں نے اسی قوم میں شادی کر لی ہو گی لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزارنے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی مہم رویاں اور دلچسپیاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں، ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا

پھر جب ہمارے فرساکے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوا۔ انہوں نے کہا: نہ ڈرو اور نہ رنج کرو۔ ہم تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچالیں گے، سوائے تمہاری بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہے ہم اس سستی انجام اپنے شہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اُس قوم کے ساتھ ہوا جس کے ساتھ اس نے اپنا دین و اخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔

۵۵۔ اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرشتے بہت خوب صورت و عزیز لڑکوں کی شکل میں آتے تھے۔ حضرت لوط اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ میں اپنے ان مہمانوں کو پھیراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ پھیراؤں تو یہ بڑی بے مروتی ہے جسے شرافت گوارا نہیں کرتی، مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان مسلمانوں کو اپنی پناہ میں نہ لے لوں گا تو رات انہیں کہیں اور گزارنی پڑے گی اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گریبا میں نے خود انہیں پھیراؤں کے حوالہ کیا۔ اس کے بعد کا قصہ یہاں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیلات سورہ ہود، الحجر اور القمر میں بیان ہوئی ہیں کہ ان لڑکوں کی آمد کی خبر سن کر شہر کے بہت سے لوگ حضرت لوط کے مکان پر ہجوم کر کے آگئے اور اصرار کرنے لگے کہ وہ اپنے ان مہمانوں کو بدکاری کے لیے اٹھائے کریں، ۵۶۔ یعنی ہمارے معاملہ میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات کے لیے غرمند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچایا جاتے یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوط پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنہیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ سورہ ہود میں اس کی تصریح ہے کہ جب لوگ حضرت لوط کے گھر میں گھسے چلے آ رہے تھے اور آپے محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہمانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے تو آپ پریشان ہو کر چیخ اٹھے کہ لَوَّانَ لِي نِيكْمُ قُوَّةٌ اَوْ اَوْحِي اِلَيَّ رُكُوْنًا مِّنْ دُوْنِكَ، کاش میرے پاس تمہیں ٹھیک کر دینے کی طاقت ہوتی یا کسی زور آور کی حمایت میں پاسکتا۔ اس وقت فرشتوں نے کہا يَا لُوْطُ اِنَّا مِّنْ رَّبِّكَ لَن نَّبِيْلُوْا اِلَيْكَ لَے لوط، ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، یہ آپ کے مہمانوں تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اُس فتن کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔ اور ہم نے اُس سستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور روزِ آخر کے امیدوار رہو اور زمین میں مفسد بن کر زیادتیاں نہ کرتے پھرو" مگر انہوں نے اسے جھٹلایا۔ آخر کار ایک سخت زلزلے

۵۹ اس کھلی نشانی سے مراد ہے بحیرہ مردار جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کفار مکہ کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کرتوتوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہ عام پر موجود ہے جسے تم شام کی طرف اپنے تجارتی سفروں میں جاتے ہوئے شب روز دیکھتے ہو۔ **وَإِنَّهَا لَبَسَبِيلٌ مُّقِيمٌ (الحجر) اور وَإِنَّكُمْ لَلتَّوَّابِينَ عَلَيْكُمْ مُّصِيبِينَ وَبِاللَّيْلِ (الصافات)۔**

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بحیرہ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلہ کی وجہ سے زمین و حنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصے میں قوم لوط کا مرکزی شہر سدوم (SODOM) واقع تھا۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی بستیوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آئے ہیں۔

۶۰ عملی قوم لوط کی شرعی منرا کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۵۳-۵۴

۱۱۰ تقابل کے لیے ملاحظہ ہو الاعراف رکوع ۱۱- ہود ۸- الشعراء ۱۰۔

۱۱۱ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت کے آنے کی توقع رکھو، یہ نہ سمجھو کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینا

نے انہیں آلیا اور وہ اپنے گھر میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔

اور عاد و ثمود کو ہم نے ہلاک کیا، تم وہ مقامات دیکھ چکے ہو جہاں وہ رہتے تھے۔ ان کے اعمال کو شیطان نے ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور انہیں راہِ راست سے برگشتہ کر دیا حالانکہ وہ ہوش گوش رکھتے تھے۔ اور فارون و فرعون و ہامان کو ہم نے ہلاک کیا۔ موسیٰ ان کے پاس بیات لیکر آیا مگر انہوں نے زمین میں اپنی بڑائی

اور بڑاؤ سزا پانا ہو، دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ کام کرو جس سے تم آخرت میں انجام بہتر پونے کی امید کر سکو۔

۳۱۱ یعنی اس بات کو تسلیم نہ کیا کہ حضرت شعیب اللہ کے رسول ہیں، اور یہ احکام جو وہ دے رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، اور ان کی خلاف ورزی کا نتیجہ انہیں عذابِ الہی کی شکل میں بھگتنا ہوگا۔

۳۱۲ گھر سے مراد وہ پورا علاقہ ہے جس میں یہ قوم رہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب ایک پڑیا قوم کا ذکر ہو رہا ہو تو اس کا گھر اس کا ملک ہی ہو سکتا ہے۔

۳۱۳ عرب کے جن علاقوں میں یہ دونوں قومیں آباد تھیں ان سے عرب کا پچھوچھ واقعہ تھا جنوبی عرب کا پورا علاقہ جو اب احناف، یمن اور حضرموت کے نام سے معروف ہے، قدیم زمانہ میں عاد کا مسکن تھا اور اہل عرب اس کو جانتے تھے۔ حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ وغیرہ سے تیما اور تبوک تک سلاطہ آج بھی نمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے اور نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہونگے۔

۳۱۴ یعنی جاہل و نادان نہ تھے۔ اپنے اپنے وقت کے بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے۔ اور اپنی دنیا کے معاملات انجام دینے میں پوری ہوشیاری اور دانائی کا ثبوت دیتے تھے اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ شیطان ان کی آنکھوں پر ٹپی باندھ کر اور ان کی عقل سلب کر کے انہیں اپنے راستے پر گھمسنے لگا۔ نہیں، انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر آنکھوں دیکھتے شیطان کے پیش کیے ہوتے اُس راستے

کا زعم کیا حالانکہ وہ سبقت لے جانے والے نہ تھے۔ آخر کار ہر ایک کو ہم نے اس کے گناہ میں پکڑا، پھر ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر اتر کرنے والی ہوا بھیجی، اور کسی کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا، اور کسی کو ہم نے زمین میں دھسا دیا، اور کسی کو غرق کر دیا۔ اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا، مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔

کو اختیار کیا جس میں انہیں بڑی لذتیں اور منفعتیں نظر آتی تھیں اور انبیاء کے پیش کیے ہوئے اس راستے کو چھوڑ دیا جو انہیں خشک اور بدفرہ اور اخلاقی پابندیوں کی وجہ سے تکلیف دہ نظر آتا تھا۔
۶۷ یعنی بھاگ کر اللہ کی گرفت سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔ اللہ کی تدبیروں کو ناکام کر دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔

۶۸ یعنی عادی بن پر مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک سخت ہوا کا طوفان برپا رہا۔

(سورۃ الحاقہ، آیت ۷)

۶۹ یعنی ثمود۔

۷۰ یعنی قارون۔

۷۱ یعنی فرعون اور ہان۔

۷۲ یہ تمام قصے جو یہاں تک سنائے گئے ہیں، ان کا روئے سخن دو طرف ہے۔ ایک طرف یہ اہل ایمان کو سناتے گئے ہیں تاکہ وہ پست ہمت اور دل شکستہ و مایوس نہ ہوں اور مشکلات و مصائب کے سخت سے سخت طوفان میں بھی صبر و استقلال کے ساتھ حق و صداقت کا علم بلند کیے رکھیں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں کہ آخر کار اس کی مدد ضرور آئیگی اور وہ ظالموں کو نچا دکھائے گا اور کلمہ حق کو سر بلند کرے گا۔ دوسری طرف یہ ان ظالموں کو بھی سناتے گئے ہیں جو اپنے نزدیک تحریک اسلامی کا بالکل قطع کر دینے پر تلمے ہوئے تھے۔ ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ تم خدا کے علم اور اس بڑبادی کا غلط مطلب سے رہے ہو تم نے خدا کی خدائی کو اندھیر نگری سمجھ لیا ہے تبہیں اگر بغاوت و سرکشی اور ظلم و ستم اور بد اعمالیوں پر ابھی تک نہیں پکڑا گیا ہے اور سننے کے لیے

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنائے ہیں ان کی مثال مٹری جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مٹری کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو بھی پکارتے ہیں اللہ محض ازراہ عنایت لمبی مہلت دی گئی ہے تو تم اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہاں کوئی انصاف کرنے والی طاقت سرے سے ہے ہی نہیں اور اس زمین پر جس کا جو کچھ جی چاہے بلا تہایت کیے جاسکتا ہے۔ یہ غلط فہمی آخر کار تمہیں جس انجام سے دوچار کر کے رہیگی وہ وہی انجام ہے جو تم سے پہلے قوم نوح اور قوم لوط اور قوم ثعلیبہ دیکھ چکی ہے، جس سے عاقبتاً دوچار ہو چکے ہیں، اور جسے قارون فرعون نے دکھا ہے۔

لکھ اور عربی قوموں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب شرک میں مبتلا تھیں اور اپنے معبودوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست (GUARDIANS) ہیں، ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کی پوجا پاٹ کر کے اور انہیں نذر و نیاز دے کر جب ہم ان کی سرپرستی حاصل کر لیں گے تو یہ ہمارے کام بنائیں گے اور ہم کو ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھیں گے لیکن جیسا کہ اوپر کے تاریخی واقعات میں دکھایا گیا ہے، ان کے یہ تمام عقائد و وہاں اُس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اُس وقت کوئی دیوتا، کوئی اوتار، کوئی ولی، کوئی روح اور کوئی جن یا فرشتہ، جسے وہ پوجتے تھے، ان کی مدد کو نہ آیا اور اپنی باطل توقعات کی ناکامی پر کف افسوس ملتے ہوئے وہ سب ہونڈ خاک ہو گئے۔ ان واقعات کو بیان کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ مشرکین کو متنبہ کر رہا ہے کہ کائنات کے حقیقی مالک و فرمانروا کو چھوڑ کر بالکل بے اختیار بندوں اور سراسر خیالی معبودوں کے اعتماد پر جو توقعات کا گھر وندا تم نے بنا رکھا ہے اس کی حقیقت مٹری کے جلنے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح مٹری کا جالا ایک انگلی کی چوڑی بھی برداشت نہیں کر سکتا اسی طرح تمہاری توقعات کا یہ گھر وندا بھی خدا کی تدبیر سے پہلا تصادم ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ یہ

اسے خوب جانتا ہے اور وہی زبردست اور حکیم ہے۔ یہ مثالیں ہم لوگوں کی فہمائش کے لیے دیتے ہیں مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے، اور حقیقت اس میں

محض جہالت کا کرشمہ ہے لہذا ان اویام کے چکر میں پڑے ہوئے ہر حقیقت کا کچھ بھی علم نہیں ہوتا تو تم ان بے بنیاد سہاروں پر اپنا نظام حیات کبھی تعمیر نہ کرتے حقیقت میں یہ ہے کہ اختیارات کا مالک اس کائنات میں ایک رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہے اور اسی کا سہارا وہ سہارا ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَبِيحٌ عَلَيْهِمُ الرَّبُّ ۖ (آیت ۲۵۶) جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لاتے اُس نے وہ مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

لکھ یعنی اللہ کو ان سب چیزوں کی حقیقت خوب معلوم ہے جنہیں یہ لوگ معبود بنائے بیٹھے ہیں اور مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ طاقت کا مالک صرف اللہ ہی ہے اور اسی کی تدبیر و حکمت اس کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔

ایک دوسرا ترجمہ اس آیت کا یہ بھی ہو سکتا ہے: اللہ خوب جانتا ہے کہ اُسے چھوڑ کر جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کچھ بھی نہیں ہیں (یعنی بے حقیقت ہیں) اور عزیز و حکیم بس وہی ہے۔
۵۷ یعنی کائنات کا یہ نظام حق پر قائم ہے نہ کہ باطل پر۔ اس نظام پر جو شخص بھی صداقت من کے ساتھ غور کرے گا اس پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ زمین و آسمان اویام و تخیلات پر نہیں بلکہ حقیقت و واقعیت پر کھڑے ہیں۔ یہاں اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ جو کچھ بھی سمجھ بیٹھے اور اپنے وہم و گمان سے جو فلسفہ بھی کھڑے وہ ٹھیک بیٹھ جائے۔ یہاں تو عرف وہی چیز کا میاب ہو سکتی ہے اور قرار و ثبات پاسکتی ہے جو حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو۔ خلاف واقعہ قیاسات اور مفروضات پر جو عمارت بھی کھڑی کی جائے گی وہ آخر کار حقیقت سے

ایک نشانی ہے اہل ایمان کے ایسے۔

راے نبی (تلاوت کرو اس کتاب کی جو تمہاری طرف وحی کے ذریعہ سے بھیجی گئی ہے اور نماز قائم کرو، یقیناً نماز بخش اور برے کاموں سے

سے ٹکا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ نظام کائنات صاف شہادت دے رہا ہے کہ ایک خدا اس کا خالق ہے اور ایک ہی خدا اس کا مالک و مدبّر ہے۔ اس امر واقعی کے خلاف اگر کوئی شخص اس مفروضے پر کام کرتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، یا یہ فرض کر کے چلتا ہے کہ اس کے بہت سے خدا ہیں جو نذر و نیاز کا مال کھا کر اپنے عقیدت مندوں کو یہاں سب کچھ کرنے کی آزادی اور بحیریت رہنے کی ضمانت دے دیتے ہیں تو حقیقت اس کے ان مفروضات کی بدولت ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہوگی بلکہ وہ خود ہی کسی وقت ایک صدمہ عظیم سے دوچار ہوگا۔

یعنی زمین و آسمان کی تخلیق میں توحید کی صداقت اور شرک و دہریت کے بطلان پر ایک صاف شہادت موجود ہے، مگر اس شہادت کو صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی پیش کی ہوئی تعلیمات کو مانتے ہیں۔ ان کا انکار کر دینے والوں کو سب کچھ دیکھنے پر بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

حکے خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر دراصل مخاطب تمام اہل ایمان ہیں۔ ان پر جو ظلم و ستم اُس وقت توڑے جا رہے تھے، اور ایمان پر قائم رہنے میں جن شدید جو صدمہ شکن مشکلات سے ان کو سابقہ پیش آ رہا تھا، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پچھلے چار کورسوں میں صبر و ثبات اور توکل علی اللہ کی مسلسل تلقین کرنے کے بعد اب انہیں عملی تدبیر بتائی جا رہی ہے کہ قرآن کی تلاوت کریں اور نماز قائم کریں، کیونکہ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جو ایک مومن میں وہ مضبوط سیرت اور وہ زبردست صلاحیت پیدا کرتی ہیں جن سے وہ باطل کی ٹہری سے ٹہری طغیانوں اور بدی کے سخت سے سخت طوفانوں کے مقابلہ میں صرف کھڑا رہ سکتا ہے بلکہ ان

منہ پھر سکتا ہے۔ لیکن تلاوتِ قرآن اور نماز سے یہ طاقت انسان کو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ قرآن کے محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کی تعلیم کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اپنی روح میں جذب کرتا چلا جائے۔ اور اس کی نماز صرف حرکاتِ بدن تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے قلب کا وظیفہ اور اس کے اخلاق و کردار کی قوت محرکہ بن جائے۔ نماز کے وصفِ مطلوب کو تو آگے کے فقرے میں قرآن خود بیان کر رہا ہے۔ رہتی تلاوت تو اس کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ جو تلاوت آدمی کے حلق سے تجاوز کر کے اس کے دل تک نہیں پہنچتی وہ اسے کفر کی طغیانوں کے مقابلے کی طاقت تو درکنار، خود ایمان پر قائم رہنے کی طاقت بھی نہیں بخش سکتی، جیسا کہ حدیث میں ایک گروہ کے متعلق آیا ہے کہ یقرؤون القرآن ولا یجاذر حناجرهم یمس قون من الدین من وق السہم من الرمیۃ، وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیرکمان سے نکل جاتا ہے۔ (بخاری، مسلم، موطا)۔ درحقیقت جس تلاوت کے بعد آدمی کے ذہن و فکر اور اخلاق و کردار میں کوئی تبدیلی نہ ہو بلکہ قرآن پڑھ کر بھی آدمی وہ سب کچھ کرتا رہے جس سے قرآن منع کرتا ہے وہ ایک مومن کی تلاوت ہے ہی نہیں۔ اس کے متعلق تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ ما امن بالقرآن من استحل محارمہ، قرآن پر ایمان نہیں لایا وہ شخص جس نے اس کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لیا۔ (ترمذی بقضا صحیحہ بروی رضی اللہ عنہ)۔ ایسی تلاوت آدمی کے نفس کی اصلاح کرنے اور اس کی روح کو تقویت دینے کے بجائے اس کو اپنے خدا کے مقابلہ میں اور زیادہ ڈھیٹ اور اپنے ضمیر کے آگے اور زیادہ بے حیا بنا دیتی ہے اور اس کے اندر کبر کا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دیتی۔ کیونکہ جو شخص قرآن کو خدا کی کتاب مانے اور اسے پڑھ کر یہ معلوم بھی کرتا رہے کہ اس کے خدا نے اسے کیا ہدایات دی ہیں اور پھر اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرتا چلا جائے اس کا معاملہ تو اس جرم کا سلسلہ ہے جو قانون سے ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ قانون سے خوب واقف ہونے کے بعد جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس پوزیشن کو

روکتی ہے اور اللہ کا ذکر اس سے بھی زیادہ بڑی چیز ہے۔ اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔
 مگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سے فقرے میں بہترین طریقے پر یوں واضح فرمایا ہے کہ
 القرآن حجۃ لک او علیک، ”قرآن حجّت ہے تیرے حق میں یا تیرے خلاف“ (مسلم، یعنی اگر تو قرآن کی
 ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے تو وہ تیرے حق میں حجّت ہے۔ دنیا سے آخرت تک یہاں بھی تجھ سے
 باز پرس ہو، تو اپنی صفائی میں قرآن کو پیش کر سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے اس کتاب کے مطابق کیا ہے۔
 اگر تیرا عمل واقعی اس کے مطابق ہو تو نہ دنیا میں کوئی حاضی اسلام تجھے منرا لے سکے گا اور نہ آخرت
 میں داؤدِ مشرکی کے ہاں اس پر تیری پکڑ ہوگی۔ لیکن اگر یہ کتاب تجھے پہنچ چکی ہو، اور تو نے اسے چھک
 یہ معلوم کر لیا ہو کہ تیرا رب تجھ سے کیا چاہتا ہے، کس چیز کا تجھے حکم دیتا ہے اور کس چیز سے تجھے منع کرتا
 ہے، اور پھر تو اس کے خلاف رویہ اختیار کر کے تو یہ کتاب تیرے خلاف حجّت ہے۔ یہ تیرے خدا کی
 عدالت میں تیرے خلاف فوجداری کا مقدمہ اور زیادہ مضبوط کر دیگی۔ اس کے بعد ناواقفیت کا عند پیش
 کر کے بچ جانا یا ملکی منرا پانا تیرے لیے ممکن نہ رہے گا۔

۵۵۰ یہ نماز کے بہت سے اوصاف میں سے ایک وصف ہے جسے موقع و محل کی مناسبت
 سے یہاں نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مگر کے اس ماحول میں جن شدید فراہمتوں سے مسلمانوں کو سابقہ
 درپیش تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انہیں مادی طاقت سے بڑھ کر اخلاقی طاقت درکار تھی۔ اس
 اخلاقی طاقت کی پیدائش اور اس کے نشوونما کے لیے پہلے دو تدبیروں کی نشان دہی کی گئی۔ ایک
 تلاوتِ قرآن۔ دوسرے اقامتِ صلوٰۃ۔ اس کے بعد اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ وہ تدبیر
 ہے جس سے تم لوگ ان برائیوں سے پاک ہو سکتے ہو جن میں اسلام قبول کرنے سے پہلے تم خود
 مبتلا تھے اور جن میں تمہارے گرد و پیش اہل عرب کی اور عرب سے باہر کی جاہلی سوسائٹی اس وقت
 مبتلا ہے۔

غور کیا جاسے تو یہ بات باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس موقع پر نماز کے اس خاص قاعدے
 کا ذکر کیوں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونا اپنے اندر صرف آتنا ہی قاعدہ نہیں

دکھتا کہ یہ بجائے خود ان لوگوں کے لیے دنیا و آخرت میں نافع ہے جنہیں یہ پاکیزگی حاصل ہو، بلکہ اس کا لازمی فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے ان کو ان سب لوگوں پر زبردست برتری حاصل ہو جاتی ہے جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہوں اور جاہلیت کے اس ناپاک نظام کو جو ان برائیوں کی پرورش کرتا ہے، برقرار رکھنے کے لیے ان پاکیزہ انسانوں کے مقابلہ میں اٹھری چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ فحشاء اور منکر کا اطلاق جن برائیوں پر ہوتا ہے انہیں انسان کی فطرت برا جانتی ہے اور ہمیشہ سے ہر قوم اور ہر معاشرے کے لوگ، خواہ وہ عملاً کیسے ہی بگڑے ہوئے ہوں، اصولاً ان کو برا ہی سمجھتے رہے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت عرب کا معاشرہ بھی اس عام کلیے سے مستثنیٰ نہ تھا۔ اس معاشرے کے لوگ بھی اخلاق کی معروف خوبیوں اور برائیوں سے واقف تھے، بدی کے مقابلے میں نیکی کی قدر پہچانتے تھے اور شاید ہی ان کے اندر کوئی ایسا شخص ہو جو برائی کو بھلائی سمجھتا ہو یا بھلائی کو بُری نگاہ سے دیکھتا ہو۔ اس حالت میں اس بگڑے ہوئے معاشرے کے اندر کسی ایسی تحریک کا اٹھنا جس سے وابستہ ہوتے ہی خود اسی معاشرے کے افراد اخلاقی طور پر بدل جاتیں اور اپنی سیرت و کردار میں اپنے ہم عصروں سے نمایاں طور پر بلند ہو جائیں، لامحالہ اپنا اثر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ ممکن نہ تھا کہ عرب کے عام لوگ برائیوں کو مٹانے والی اور نیک اور پاکیزہ انسان بنانے والی اس تحریک کا اخلاقی وزن محسوس نہ کرتے اور اس کے مقابلے میں محض جاہلی تعصبات کے کھوکھلے نعروں کی بنا پر ان لوگوں کا ساتھ دینے چلے جاتے جو خود اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے اور جاہلیت کے اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے لڑ رہے تھے جو ان برائیوں کو صدیوں سے پرورش کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس موقع پر مسلمانوں کو مادی وسائل اور طاقتیں فراہم کرنے کے بجائے نماز قائم کرنے کی تلقین کی تاکہ یہ مٹھی بھر انسان اخلاق کی وہ طاقت اپنے اندر پیدا کر لیں جو لوگوں کے دل جیت لے اور تیر و تنگ کے بغیر دشمنوں کو شکست دیرے۔

نماز کی یہ خوبی جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک اس کا وصف

لازم ہے یعنی یہ کہ وہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے، اور دوسرا اس کا وصف مطلوب ہے،

یعنی یہ کہ اس کا پڑھنے والا واقعی غشاء اور منکر سے رک جائے۔ جہاں تک روکنے کا تعلق ہے نماز لازماً یہ کام کرتی ہے۔ جو شخص بھی نماز کی نوعیت پر ذرا سا غور کرے گا وہ تسلیم کرے گا کہ انسان کو بڑائیوں سے روکنے کے لیے جتنے بڑے بھی لگانے ممکن ہیں ان میں سب سے زیادہ کارگر بڑے نماز ہی ہو سکتی ہے۔ آخر اس سے بڑھ کر ٹوٹر مانع اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی کو ہر روز دن میں پانچ وقت خدا کی یاد کے لیے بلایا جائے اور اس کے ذہن میں یہ بات نمازہ کی جائے کہ تو اس دنیا میں آزاد خود مختار نہیں ہے بلکہ ایک خدا کا بندہ ہے، اور تیرا خدا وہ ہے جو تیرے کھلے اور چھپے تمام اعمال سے، حتیٰ کہ تیرے دل کے ارادوں اور نیتوں تک سے واقف ہے، اور ایک وقت ضرور ایسا آنا ہے جب تجھے اس خدا کے سامنے پیش ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ پھر اس یاد دہانی پر بھی اکتفا نہ کی جائے بلکہ آدمی کو عملاً ہر نماز کے وقت اس بات کی مشق کرائی جاتی رہے کہ وہ چھپ کر بھی اپنے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے۔ نماز کے لیے اٹھنے کے وقت سے لیکر نماز ختم کرنے تک مسلسل آدمی کو وہ کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کے اور خدا کے سوا کوئی تیسری ہستی یہ جاننے والی نہیں ہوتی کہ اس شخص نے خدا کے قانون کی پابندی کی ہے یا اسے توڑ دیا ہے۔ مثلاً اگر آدمی کا وضو ماقط ہو چکا ہو اور وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو اس کے اور خدا کے سوا آخر کسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔ اگر آدمی نماز کی نیت ہی نہ کرے اور بظاہر رکوع و سجود اور قیام و قعود کرتے ہوئے اذکار نماز پڑھنے کے بجائے خاموشی کے ساتھ غزلیں پڑھتا رہے تو اس کے اور خدا کے سوا کس پر یہ راز فاش ہو سکتا ہے کہ اس نے دراصل نماز نہیں پڑھی ہے۔ اس کے باوجود جب آدمی جسم اور لباس کی ظہارت سے لیکر نماز کے ارکان اور اذکار تک قانون خداوندی کی تمام شرائط کے مطابق ہر روز پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نماز کے ذریعہ سے روزانہ کئی کئی بار اس کے ضمیر میں زندگی پیدا کی جا رہی ہے، اس میں ذمہ داری کا احساس بیدار کیا جا رہا ہے، اسے فرض شناس انسان بنایا جا رہا ہے، اور اس کو عملاً اس بات کی مشق کرائی جا رہی ہے کہ وہ خود اپنے جذبہ اطاعت کے زیر اثر خفیہ اور علانیہ ہر حال میں اس قانون

کی پابندی کرے جس پر وہ ایمان لایا ہے، خواہ خارج میں اس سے پابندی کرانے والی کوئی طاقت موجود ہی نہ ہو اور خواہ دنیا کے لوگوں کو اس کے عمل کا حال معلوم ہو یا نہ ہو۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ ماننے کے سوا چارہ نہیں ہے کہ نماز صرف یہی نہیں کہ آدمی کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے بلکہ درحقیقت دنیا میں کوئی دوسرا طریق تربیت ایسا نہیں ہے جو انسان کو برائیوں سے روکنے کے معاملہ میں اس درجہ مؤثر ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی نماز کی پابندی اختیار کرنے کے بعد عملاً بھی برائیوں سے رکتا ہے یا نہیں، تو اس کا انحصار خود اس آدمی پر ہے جو اصلاح نفس کی یہ تربیت لے رہا ہو۔ وہ اس سے قائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو نماز کے اصلاحی اثرات اس پر مرتب ہوتے، ورنہ ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی تدبیر اصلاح بھی اس شخص پر کارگر نہیں ہو سکتی جو اس کا اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہو یا جان بوجھ کر اس کی تاثیر کو دفع کرتا رہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے غذا کی لازمی خاصیت بدن کا تغذیہ اور نشوونما ہے، لیکن یہ قائدہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آدمی اسے جنہو بدن بننے دے۔ اگر کوئی شخص ہر کھانے کے بعد وہی تھے کر کے ساری غذا باہر نکالتا چلا جائے تو اس طرح کا کھانا اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتا۔ جس طرح ایسے شخص کی نظر سامنے لاکر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ غذا موجب تغذیہ بدن نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص کھانا کھانے کے باوجود سوکھتا چلا جا رہا ہے، اسی طرح بد عمل نمازی کی مثال پیش کر کے آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ نماز برائیوں سے روکنے والی نہیں ہے کیونکہ فلاں شخص نماز پڑھنے کے باوجود بد عمل ہے۔ ایسے نمازی کے متعلق تو یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت نماز نہیں پڑھتا جیسے کھانا کھا کر تھے کر دینے والے کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ درحقیقت کھانا نہیں کھاتا۔ ٹھیک یہی بات ہے جو متعدد احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض اکابر صحابہ و تابعین سے مروی ہوئی ہے۔ عمران بن حصین کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا من لم تنهہ سلاتہ عن الفحشاء والمنکر فلا سلاة له، جسے اس کی نماز نے فحش اور رے کاموں سے روکا اس کی نماز نماز نہیں ہے (ابن ابی حاتم)۔ ابن عباس حضور کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: من لم تنهہ صلواتہ

عن الفحشاء والمنکر لم یزد دہا من اللہ الا بعدا؛ جس کی نماز نے اسے فحش اور برے کاموں سے روکا اس کو اس کی نماز نے اللہ سے اور زیادہ دُور کر دیا۔ (ابن ابی حاتم، طبرانی)۔ یہی مضمون جناب حسن بصری نے بھی حضور سے مرسل روایت کیا ہے (ابن جریر، بیہقی)۔ ابن مسعود سے حضور کا یہ ارشاد مروی ہے لاصلوٰۃ لمن لم یطع الصلوٰۃ و طاعة الصلوٰۃ ان تنہی عن الفحشاء والمنکر؛ اس شخص کی کوئی نماز نہیں ہے جس نے نماز کی اطاعت نہ کی، اور نماز کی اطاعت یہ ہے کہ آدمی فحشاء و منکر سے رک جائے۔ (ابن جریر، ابن ابی حاتم)۔ اسی مضمون کے متعدد اقوال حضرات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس حسن بصری، قتادہ اور اعش وغیر ہم سے منقول ہیں۔ امام جعفر صادق فرماتے ہیں، جو شخص یہ معلوم کرنا چاہے کہ اس کی نماز قبول ہوئی ہے یا نہیں اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کی نماز نے اسے فحشاء اور منکر سے کہاں تک باز رکھا۔ اگر نماز کے روکنے سے وہ برائیاں کرنے سے رک گیا ہے تو اس کی نماز قبول ہوئی ہے۔ (صحیح المعانی، ۱۹۷) اس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا ذکر (یعنی نماز) اس سے بزرگ تر ہے۔ اس کی تاثیر صرف سلبی ہی نہیں ہے کہ برائیوں سے روکے، بلکہ اس سے بڑھ کر وہ نیکیوں پر ابھانے والی اور سعیت الی الخیرات پر آمادہ کرنے والی چیز ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یاد بجاتے خود بہت بڑی چیز ہے خیر الاعمال۔ انسان کا کوئی عمل اس سے افضل نہیں ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا تمہیں یاد کرنا تمہارے اس کو یاد کرنے سے زیادہ بڑی چیز ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ (سبحرہ آیت ۱۵۲)۔ تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ پس جب بندہ نماز میں اللہ کو یاد کرے گا تو لا محالہ اللہ بھی اس کو یاد کرے گا۔ اور یہ فضیلت کہ اللہ کسی بندے کو یاد کرے، اس سے بزرگ تر ہے کہ بندہ اللہ کو یاد کرے۔ ان تین مطالب کے علاوہ ایک اور لطیف مطلب یہ بھی ہے جسے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے بیان کیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی یاد نماز تک محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جب آدمی روزہ رکھتا ہے، یا زکوٰۃ دیتا ہے، یا کوئی نیک کام کرتا ہے تو لا محالہ اللہ کو یاد ہی کرتا ہے، تبھی تو اس سے وہ عمل نیک صادر ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آدمی کسی برائی کے موقع سامنے آنے پر اس سے پرہیز کرتا ہے تو یہ بھی اللہ کی یاد ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے یاد الہی ایک مومن کی پوری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔